اردو ناول میں تاریخیت اور نو تاریخیت

Historicism and New Historicism in Urdu Novel

ڈاکٹر ناہید قمر،اسسٹنٹ پروفیسر اردو،فیڈرل اردو یونیورسٹی،اسلام آباد

Abstarct:

Historicism as a literary theory Considers history a background of literature, whereas New Historicism envisages and practices a mode of Study where the literary text and Non_ literary Context are given equal weightage. This Article presents a critical overview of Selected Urdu novels in the context of these two theories.

Key Words :Historicism, New Historicism, Novel, Collective Consciousness, Cultural and HistoricalPerspective,StylisticClustering,

اردو ناول کا فن تاریخ اور سوانح کے بہت قریب رہا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ تاریخ کے برعکس ناول ایک پورے دور کی زندگی کی جیتی جاگتی دستاویز ہے جس کے مطالعے کے دوران قاری براہِ راست اس تجربے سے گزرتا ہے کہ ایک مخصوص دور زندہ رہنے کے کیا معنی تھے؟ اور یہ کہ کس طرح ایک پورا عہد اور اس کی تہذیب وتمدن زبان کے وسیلے سے ایک مستند تاریخی متن کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ رویہ تاریخی نہیں تخلیقی ہے اور اس امر کا جائزہ ایک دلچسپ مطالعے کی بنیاد بن سکتا ہے کہ تاریخیت کے شعور سے مملو اور نو تاریخیت کے حصار میں گھرے ان ناولوں کا فنی معیار کیا ہے؟ کیوں کہ ناول کا فن اگر تاریخی اور تہذیبی عناصر کو فن پارے کی داخلی وحدت کے Intrinsic اجزا بنانے سے قاصر رہے تو ناول ایک فنی اکائی کے بجائے اسلوبیاتی مغلوبہ بن کر رہ جاتا ہے۔

اشیا،مظاہر اور واقعات کا تجربہ تضادات کے حوالے سے لے کر نا بعد نو آبادیاتی رویہ ہے اور اس حوالے سے گزشتہ سات عشروں میں لکھے جانے والے ادب کے متن اور تناظر کے ضمن میں بہت سے زاویے تفہیمِ نو کے متقاضی ہو سکتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ گزشتہ کچھ عرصے سے ہمارے ہاں ادب کے تہذیبی و تاریخی تناظرات کے مطالعے کا رجحان غالب رہا ہے، جسے اجتماعی شعور کی Decolonization کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔تاریخیت وہ فکری رویّہ ہے جو سیاسی و تاریخی شعور،عصری آگہی اور سماجی درک سے انسلاک رکھنے والے تمام متون کا احاطہ کرتا ہے۔کیوں کہ نہ تو تاریخ محض واقعات کا سلسلہ ہے اور نہ ہی تاریخی،تہذیبی،سیاسی وعصری شعور سے آگہی کا مطلب روایتی معنوں میں تاریخی ناول نگار ہونا۔تاریخیت تو تاریخی حقائق کے استناد کو برقرار رکھتے ہوئے فرد اور تاریخ کے باہمی تعامل کو جمالیاتی تجربے میں بدلنے کا نام ہے، جب کہ نو تاریخیت محض اس سوال کا جواب تلاش نہیں کرتی کہ در

حقیقت کیا ہوا؟ بل کہ اس کا سروکار اس امر سے بھی ہے کہ جدید ذہن اس حقیقت تک رسائی کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ دوسرا مسئلہ تاریخ کی تحقیقی سرگرمی، جدلیات، منہاجیات و بنیادی ماخذات وشواہد کے استناد کے تجزیے سے جڑا ہوا ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ تاریخیت اور نو تاریخیت کو حقائق کے کسی ایک سانچے تک محدود کر دیا جائے۔ تاہم وہ موضوعات جو ان دو فکری مباحث کے تحت ادب میں عموماً اور ناول میں بالخصوص مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں ان میں بعد نو آبادیت، صنفی مطالعات اور شناخت کے اسطورہ خصوصی طور پر اہم ہیں کہ افراد اور قومیں اپنے عصر کے عقائد اور اقدار سے ذہنی جڑت قائم کرنے کے لیے ماضی کی یادوں کا انتخاب اور تفہیم کس طرح ان کی اہمیت کے تناظر میں کرتے ہیں اور اس سرگرمی کے دوران تاریخی حقائق تشکیل و تنسیخ کے کن مراحل سے گزرتے ہیں۔

> "یہ (تاریخت) ایک ایسی ادبی اصطلاح ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ادب کسی بھی دور کا ہو، اس کا جائزہ لیتے وقت اسی دور کے تصورات اور نقطہ ہائے نظر کا سیاق وسباق سامنے رہنا چاہیے۔ اعلیٰ درجے کے ادب کو کسی خاص عہد تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ تاہم ادیب اور شاعر اپنے دور کی مخصوص معاشرتی فضا اور مخصوص عقلی رویوں کے تحت ادب تخلیق کرتا ہے اور اس فضا یا رویوں کا عکس کسی نہ کسی حد تک اس کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔ یہی تاریخیت ہے"۔(۱)

جب کہ نو تاریخیت متن کی قرات اور تفہیم کا وہ رویہ ہے جس میں ادبی متن کسی ایک ذہن کی نہیں بل کہ ایک مخصوص ثقافتی لمحے کی تخلیق ہوتا ہے۔ نو تاریخیت کسی مخصوص عہد کے دیگر ثقافتی مظاہر کی طرح ادبی متون پر بھی اس امر کی وضاحت کے لیے روشنی ڈالتی ہے کہ کس طرح تصورات، رویّے اور نظریات ایک وسیع ثقافتی منظر نامے سے ماورا بھی زمینی حقائق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تاریخی تناظر اور تصورات کے تجزیئے کے ساتھ ساتھ نو تاریخیت یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ قاری اور نقاد کے تنقیدی تصورات ان کی مخصوص تاریخی صورت حال کے پیشِ نظر تعصّبات کا شکار ہیں اور چوں کہ کسی شخص کا اپنی تاریخیت سے فرار ممکن نہیں لہٰذا کسی متن کے معنی طے شدہ یا حتمی نہیں بل کہ سیال ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نو تاریخیت ادبی متون کو نہ صرف تاریخی تناظر کی تخلیق تصور کرتی ہے بل کہ کسی عہد اور علاقے کی ثقافتی اور علمی تاریخ کا وسیلہ بھی۔ کیوں کہ درحقیقت نو تاریخیت کسی طے شدہ فطری رویّے کا نام نہیں بل کہ تاریخ، ثقافت اور ادب کے پیچیدہ رشتوں کو سمجھنے کے ان طریقوں کا نام ہے جن میں یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ تاریخ اور ثقافت ادب میں اور ادب تاریخ اور ثقافت میں سانس لیتا ہے اور یہ رشتے جتنے سطح پر ہیں اس سے کہیں زیادہ ان کی جڑیں تہ در تہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تاریخ کی متنیت اور متون کی تاریخیت کا دوسرا نام نو تاریخیت ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث اردو ناول کی قرات و تفہیم میں کس طرح مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ اردو میں جدید ناول کے خدوخال بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ابھرے اور اپنے مزاج کے اعتبار سے زندگی سے زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ تہذیب، اقدار، مذہب، سماج اور تاریخ کے تناظر میں انسانی وجود کی حیثیت کے ضمن میں بعض فکری رویّے بیسویں صدی کے عام ذہنی کردار اور خصوصاً عظیم جنگوں کے نفسیاتی اثرات کے تحت تقسیمِ

برصغیر سے پہلے اور بعد کے ادب میں مشترک نظر آتے ہیں۔مثلاً انسان کے روحانی خلا، بے زمینی اور عدم تحفظ کا احساس ،سماجی ، تہذیبی اور تاریخی تناظر میں انسان کے مقام کا سوال فسادات، سرحدوں کی تقسیم ، جلا وطنی، نسلی تعصّبات،تہذیبی تصادم،انسانی حقوق کا استحصال،مسئلہ جبر وقدر،تاریخ کی حشر سامانیاں اور مختلف فلسفوں کے انسانی فکر وعمل پر اثرات۔ یہ سب سوالات اور ان سے انسلاک رکھنے والے مباحث تقسیم کے بعد کے ناولوں میں بالعموم اور گزشتہ دو عشروں کے ناولوں میں بالخصوص موجود ہیں اور گو کہ یہ سوالات سرحد کے دونوں طرف لکھے جانے والے اردو ناولوں کا موضوع رہے ہیں تاہم یہاں منتخب صرف پاکستانی ناولوں میں متذکرہ مباحث کا جائزہ درج کیا جا رہا ہے۔

تقسیم کے موضوع پر لکھے جانے والے چند اہم ناولوں میں خدیجہ مستور(1982ء-1927ء) کا ناول "آنگن"(1962ء)اس حوالے سے کافی اہمیت کا حامل ہے کہ ایک خاندان کی کہانی ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیبی، نظریاتی اور معاشرتی تصادمات اور مماثلتوں کی بنا پر پورے برصغیر کی علامت بن کر بھی سامنے آتا ہے۔ناول کا مرکزی خیال تہذیب کی روح کی تلاش ہے جس کے لیے ماضی اور حال کو آمیز کر کے ایک فکری وحدت ترتیب دی گئی ہے۔

انتظار حسین(2016ء-1923ء) کا ناول" بستی "(1980ء) ہندوستان کے تارکین وطن کا نوحہ ہے اور ناول میں اس خیال کی تکرار کہ ہم جو بوتے ہیں وہی کاٹتے ہیں،تاریخ قوتوں کے جبر کا احساس دلاتی ہے۔ناول میں اساطیری و مذہبی حوالے سے سب مل جل کر کہانی کی فضا تیار کرتے ہیں۔" تذکرہ"(1987) میں زندگی کے انتشار کا استعارہ ہجرت سے پھیلتے پھیلتے تاریخ کے جس موڑ پر پہنچا ہے، وہاں مایوسی اور تاریکی ہے۔یہ ناول اپنے قاری کو بتاتا ہے کی جمے جمائے معاشروں میں سیاست اور تاریخ اس تہلکہ خیزی کے ذمہ دار ہوتے ہیں جس سے ملکوں کے نقشے تبدیل ہو جاتے ہیں اور پرانی اقدار کے ملبے سے نئی اقدار جنم لیتی ہیں۔" آگے سمندر ہے"(1995ء) میں "بستی" اور "تذکرہ" کے تہذیبی مسائل کو ایک نئی معنوی جہت عطا کر دی گئی ہے۔" آگے سمندر ہے" تاریخی ناول نہیں لیکن تاریخی شعور کا ناول ضرور ہے جس میں سماجی ڈھانچے کا انہدام اور فرد کی ذہنی گم شدگی کا منظر پیش کیا گیا ہے جہاں جواد کو گولی لگتی ہے، نیم بے ہوشی کے عالم میں اس سب کچھ یاد آجاتا ہے۔انسانی تاریخ میں جو شہر اجڑے اور جو لوگ اپنی جڑوں سے اکھڑے، ان کی معدومیت کا دکھ یا داشت کی تہوں سے نکل کر شعور کی سطح پر آجاتا ہے اور یوں فرد کا حافظہ اجتماعی حافظے کی علامت بن جاتا ہے کیوں کہ تاریخیت سے مراد انسانیت کا وہ اجتماعی حافظہ ہے جو عمل کے تسلسل اور ترسیلِ معنی کی ضمانت مہیا کرتا ہو۔یہی وجہ ہے کہ "انتظار حسین" کے یہاں اجتماعی تہذیب کے سر چشموں کی تلاش کا جو عمل مسلسل نظر آتا ہے اس میں یادِ موجود سے زیادہ تر معنویت کی حامل ہے اور یہ رویّہ تاریخ کے یک زمانی اور دو زمانی پہلو سامنے لاتا ہے۔

"عبداللہ حسین"(2015ء-1931ء) کا ناول"اداس نسلیں"(1964ء) بھی تاریخیت کے رجحان کا

عکاس ہے۔ناول کا عصری دورانیہ 1857ء کی جنگِ آزادی سے قیامِ پاکستان تک ہے،لیکن ناول میں مغلیہ دور کی باقیات کا کوئی حوالہ موجود نہیں۔قصے کا باقاعدہ آغاز جنگِ عظیم اوّل سے ہوتا ہے تاہم جلیانوالہ باغ (1919ء) کے علاوہ اس دور کی سیاسی بے چینی کا اظہار کرنے والے کسی اہم واقعے کا ذکر نہیں ہے۔پورے ناول کی سیاسی فضا اختتام پر اس نکتے میں سمٹ آتی ہے کہ تاریخ کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے تاریکی انسان کا مقدر ہوتی ہے اور یہ مقدر ان تمام نسلوں کا ہے جو سیاست اور تاریخ کی تاریک راہوں سے گزرتے ہوئے مارے جاتے ہیں یا تہی دامن رہتے ہیں۔یہ انتشار سے انتشار تک کا سفر ہے جس کی زد میں آنے والی نسلیں اداس اور قنوطیت زدہ ہو جاتی ہیں۔

اعجاز راہی (2006ء-1946ء) اس حوالے سے اپنے مضمون "پاکستان میں ناول" میں لکھتے ہیں:

> ""اداس نسلیں" فکری طور پر ایک کامیاب ناول ہے۔"عبداللہ حسین" نے ناول کی تخلیق میں جس فکری رو کو موضوعاتی تشخص دیا ہے۔اس کا دائرہ نسلوں کی تاریخ و تہذیب کے جذباتی اور فکری تار و پود میں محض ژرف نگاری کا وظیفہ نہیں،اس المیہ کا محاکاتی ستعارہ بھی ہے جو سیاسی،ثقافتی اور تہذیبی زوال وارتقا کے تحت الشعوری ادراک سے ہم آمیزی کرتا ہے"۔(2)

"عبداللہ حسین کے دوسرے اہم ناول "نادار لوگ" (1996ء) میں تاریخی قوتوں کے جبر کے اسی بیانیے کو آگے بڑھایا گیا کہ قوموں کی زندگی میں اگر آزادی کے حصول کے بعد سیاسی شعور کو سماجی شعور میں نہ بدلا جائے تو ایسے معاشروں میں چہرے اور نام تو بدلتے ہیں،نظام نہیں بدلتے۔"ڈاکٹر انور سجاد" (2019ء-1935ء) کا ناول "خوشیوں کا باغ" (1982ء) مشہور ڈچ مصور "بوش" (C.....1510 - 15 (Octo10,2019) کے تصویری پینل کے ذریعے ہمارے عہد کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ان تصاویر میں جو علامتیں اور استعارے استعمال کیے گئے ہیں وہ سب ایک فکری و سماجی عدمِ توازن کے انہدام اور انسانی اقدار کے زوال کا نوحہ سناتے ہیں۔فہیم اعظمی (وفات 14۔جولائی 2004ء) کے ناول "جنم کنڈلی" (1984ء) میں سماجی بے معنویت کے اظہار کے لیے کشکول کی علامت استعمال کی گئی ہے۔ناول نگار نے ایک فرد کے حوالے سے پوری تہذیب اور پھر اس تہذیب کا تعلق بیسویں صدی کے عالمگیر ذہنی انتشار،نا آسودگی،لایعنیت،خوف اور زوال پسندی سے جوڑ کر ناول میں واقعات کی کمی بیانیے کے تجربات سے پوری کی ہے۔

> "یہ کس کی جنم کنڈلی ہے؟اس میں نام تو ہے نہیں۔یہ ایک آدمی کی جنم کنڈلی ہے۔حادثات مختلف ہوتے ہیں مگر اثر ایک ہی ہوتا ہے۔خون کا بہنا اور بہتے رہنا"۔(3)

بانو قدسیہ (28۔نومبر 1928ء-4۔فروری 2017ء) کا ناول "راجہ گدھ" (1981ء) علامتی اظہار کی بنا پر اہمیت کا حامل ہے۔ناول کت تمام کردار مردہ رشتوں کی کسی سطح پر جیتے نظر آتے ہیں اور پھر یہی ان کی فطرت بن جاتی ہے جس کی بنا پر وہ گدھ بنتے ہیں۔ناول میں گدھ کو فطرت کا خاکروب قرار دے کر ایک اہم معاشرتی علامت وضع کی گئی ہے اور اس علامت کے ذریعے حلال و حرام کے فلسفے کی سماجی معنویت واضح کی گئی ہے۔اس ملعون

معنویت کا اثر قاری پر تادیر قائم رہتا ہے۔

مستنصر حسین تاڑر(یکم مارچ1939ء) کا ناول "بہاؤ"(2017ء) تاریخ کے جبر کو ہمارے سامنے لاتا ہے کہ- جو قومیں اور افراد تغیراتِ زمانہ کا ساتھ نہ دے پائیں- وہ معدوم ہوجاتے ہیں۔"اے غزالِ شب" آدرشوں کی شکست و ریخت سے پیدا شدہ Disillusionment کو موضوع بناتا ہے جس کے نتیجے میں افراد کی نفسیات بیگانگی اور لایعنیت کے بحران کا شکار ہوجاتی ہے) جس کا مطالعہ صدماتی بیانیے کے ضمن میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ناول کے مرکزی کردار اپنے آدرش کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد ہی اس حقیقت کا ادراک کرپاتے ہیں کہ استحصالی نظام میں آقا تو بدلتے ہیں نظام نہیں۔"راکھ(2015ء) میں کردار نہیں بل کہ تاریخیت اہم ہے۔ایلیٹ کہتا ہے کہ وہ انتشار جس سے جدید دور عبادت ہے اس کی تفسیر اسطور سے ہی ممکن ہے۔"راکھ" کی کہانی ہماری سیاسی تاریخ کے دو اہم واقعات تقسیمِ برصغیر اور سانحہ مشرقی پاکستان کے قومی نفسیات پر اثرات کے گرد بنی گئی ہے۔ناول تاریخ کو تشکیلی متن قرار دے کر رد کرتا ہے اور ادب کو سماجی حقائق کے متبادل بیانیے کے طور پر پیش کرتا ہے۔"راکھ" اور اس کے بعد منظرِ عام پر آنے والے ایک اور اہم ناول "خس و خاشاک زمانے"(2017ء) میں مستنصر حسین تاڑر نے تاریخ کو ایک تخلیقی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ایک ایسے تناظر میں جس کا کوئی مذہب نہیں۔کوئی سیاسی عقیدہ نہیں اور کوئی نظریاتی توقف بھی نہیں۔ناول نگار نے ناول کے کرداروں سے ایک جذباتی فاصلہ بھی قائم رکھا ہے چنانچہ وہ اپنے حقیقی تناظر میں خود کو نمایاں کرتے ہیں، بہت خاموشی اور متانت کے ساتھ اور بظاہر اشتراک کے بغیر۔"خس و خاشاک زمانے" انسانی فطرت میں پوشیدہ نسلی رویوں کی کشمکش اور انسانی زندگی میں مذہب اور تہذیب کی اثر آفرینی کو موضوع بناتا ہے۔تقریباً ایک صدی کے عرصے اور آٹھ نسلوں کی زندگی کے تجربے کو تیسری دنیا سے فرسٹ ورلڈ تک جغرافیائی دائروں میں سمیٹنے والا یہ ناول لاہور، گوجرانوالہ، نیویارک اور کنیڈا کے پس منظر میں پنجاب کی ثقافت، تیسری دنیا کی شہری زندگی اور تارکین وطن کے مسائل کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔تاریخ کے اتنے بڑے دینوراما کو حقیقت پسندانہ تکنیک سے سنبھالنے میں یہ اندیشہ بہرحال موجود تھا کہ ناول محض متعدد طبقات کی زندگی کی دستاویز بن کر رہ جاتا۔لیکن مستنصر حسین تاڑر کے ناولوں میں اسطور ناول کے مواد کی تنظیمی علامت نہیں بنتا بل کہ وقت کی علامت بنتا ہے جو افراد، قوموں اور تہذیبوں کو بناتا اور معدوم کرتا ہے۔یہی علامت ناول نگار کا نقطہ نظر بن گئی۔یعنی فنکار جو پہلے انسانی تماشے میں شریک تھا، اس تماشے کے انتشار میں بدلتے ہی اس سے بلند ہوگیا۔دنیا کو بدلنے کا آدرش جب پاش پاش ہوتا ہے تو آدمی فلسفیانہ دردمندی سے اس ناٹک کو دیکھتا ہے جس میں کوئی عقلی نظم و ضبط، کوئی قدری نظام اور اسباب و علل کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔اس سے اگلا مرحلہ خاموشی ہے-یعنی انتشار کا شاہد بننے سے انکار- کیوں کہ جن واقعات کے متعلق کوئی قدری یا اخلاقی فیصلہ ممکن نہیں ان کا شاہد بھی کیوں بنا جائے۔گویا اس دنیا سے منھ پھیر لینا جو فن کا موضوع بننے کی استعداد کھوچکی ہے۔فن زندگی کی تفسیر ہے، لیکن اگر حیات و کائنات میں ایسا انتشار ہو کہ تفسیر ممکن نہ رہے تو ناول کا وہ فارم)(Form بھی کارآمد نہیں رہتا جو زندگی کی تفسیر کرتا تھا۔گویا

ناول نگار کو اب ایسا Form تخلیق کرنا ہے جو انتشار کو جمالیاتی تجربے میں بدلنے کی طاقت رکھتا ہو۔ایسا جمالیاتی تجربہ جو تاریخ کے پُر انتشار ادوار میں جینے کا حوصلہ عطا کر سکے۔کیوں کہ تقدیر پرستی کردار کا تو رویّہ ہوسکتا ہے فن کار کا نہیں اور اس رویّے کو اپنانے کا مطلب تاریخ عمل کے بیان پر اکتفا کر لینا۔جب کہ انسان تاریخ سے زیادہ اپنے شعور میں زندہ رہتا ہے۔تاریخ تو محض ایک سلسلہ واقعات ہے جس کے پاس اقدار کا کوئی سرمایہ نہیں۔تاریخ میں اقدار انسان پیدا کرتا ہے کیوں کہ زندگی محض فلسفوں کے زور پر نہیں جی جاتی۔زندگی کی اپنی طاقت ہے جو تاریخ کی جابر قوتوں اور زندگی کو معنویت عطا کرنے میں کوشاں فلسفوں کی بے مائیگی کے باوجود انسان زندہ رکھتی ہے۔زندگی کی یہی طاقت "خس وخاشاک زمانے" میں نظر آتی ہے اور قاری محسوس کرتا ہے کہ انسان جن شرائط پر زندہ رہتا ہے وہی اس کی اقدار متعین کرتی ہیں۔اس طرح ہر انسان اقدار کے ایک شے نظام کی تعمیر کرتا ہے۔حالاں کہ تاریخ اور شہر کی قوتیں تو چاہتی ہیں کہ ان کے اور انسان کے مابین اقدار کا نہیں بل کہ محکومی اور انحصار رشتہ رہے تا کہ وہ انسان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں۔اس اعتبار سے اقدار کا مسئلہ انسانی زندگی کا اہم ترین مسئلہ ہے،اور ناول نگار کے لیے کردار پر توجہ مرکوز کرنے کا مطلب ہے خارجی دنیا کے انتشار میں ایک ایسا محور تلاش کرنا جہاں ان اقدار کے ملنے کے امکانات ہیں جو نظم وضبط،روشنی،بصیرت کے ضامن ہیں۔محض تاریخی حقائق کا بیان تو انتشار کی ایسی دستاویز کے سوا کچھ نہیں بن سکتا جو مایوسی پر ختم ہوتی ہو۔کردار کے داخلی عمل کے بیان میں ہی حیات بخش اقدار کے اثبات کے امکانات بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔لہٰذا ناول نگار کی گرفت انسانی زندگی پر جتنی مضبوط ہوگی اتنا ہی وہ خارجی انتشار کو جمالیاتی تجربے میں بدلنے پر قادر ہوگا۔مستنصر حسین تاڑر نے اپنے ناولوں میں یہی کمال دکھایا ہے۔

مرزا اطہر بیگ (7۔مارچ 1950ء) کا ناول "غلام باغ" (2006ء) بعد نو آبادیاتی تناظر میں لکھا گیا ہے۔کرداروں کی نوعیت علامتی ہے۔انسان کی بے توقیری اور احتجاجی رویّے اس کا موضوع ہیں لیکن اس ناول کا سب سے بڑا موضوع انسان کی انسان پر،قوموں کی قوموں پر اور نسلوں کی نسلوں پر غلبہ پانے کی خواہش ہے۔

اختر رضا سلیمی (16۔جون 1974ء) نے گزشتہ کچھ سالوں کے دوران اردو کے ایک اہم ناول نگار کے طور اپنی شناخت مستحکم کر لی ہے ان کا ناول "جاگتے ہیں خواب میں" (2015ء) انسان،خدا اور کائنات کی ازلی مثلث کے حوالے سے فلسفیانہ سوالات قاری کے سامنے لاتا ہے۔ناول کے ہیرو زمان کے جنیاتی حافظے کا سلسلہ تاریخ اور مابعد از تاریخ کا شعور عطا کرنے کے ساتھ ساتھ کائنات کے سربستہ رازوں کی تفہیم کا راستہ بھی دکھاتا ہے۔زمان 2005ء کے زلزلے میں زخمی ہو کر Coma میں چلا جاتا ہے اور اس حالت میں ایک طویل خواب سے دوچار ہوتا ہے۔بعد ازاں Coma سے تو باہر آ جاتا ہے لیکن اس خواب سے نہیں نکل پاتا جو اس نے اس کیفیت میں دیکھا تھا۔یعنی ہوش میں آنے کے بعد اس کے وجود کا ماضی تحت الشعور میں چلا جاتا ہے اور اس کا جنیاتی حافظہ اس کے لاشعور میں بیدار ہو جاتا ہے۔ہندی اساطیر کی رو سے انسان کی چار حالتیں ہیں۔خواب،بیداری،بغیر خواب کے نیند اور موت۔یعنی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زمان کا شعور اس کے وجود کی پہلی تین حالتوں کے درمیان کہیں معلق ہے اور اس کے

لیے کسی ایک حالت میں قیام کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ناول کے زیادہ تر واقعات " کالوکیسل " زمان کا آبائی گاؤں نو آباد ہے جہاں زمان کے خواب میں دیکھے ہوئے مناظر حقیقی شکل میں موجود ہیں۔طبیعات کا طالب علم ہونے کے باعث زمان اس حادثے سے گزرنے کے بعد زمان ومکان کے سوالات میں الجھنے پر مجبور پاتا ہے۔

1۔ "ہم وقت میں صرف پیچھے کیوں دیکھتے ہیں آگے کیوں نہیں۔" (4)

2۔ " کیا کائنات میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ماضی کے ساتھ ساتھ مستقبل میں بھی دیکھا جا سکے۔" (5)

3۔ "روشنی کی رفتار کے اسرار میں خلا اور وقت کے دروازے کی چابی ہے"۔ (6)

یہ اور ایسے بہت سے سوالات قاری کو وقت کی ماہیت پر غور کرنے کی تحریک دیتے ہیں لیکن ان روایتی سوالات کے ساتھ ساتھ یہاں انسانی حافظے کے یک سمتی کے حوالے سے وقت کے تیر ہونے کا سوال بھی اٹھایا گیا ہے۔ لڈوگ بولٹز مین(Ludwig Boltzman)،(20۔فروری 1844ء–05۔ستمبر 1906ء) نے بیسویں صدی کے آخر میں Thermodynamics کے قوانین کی بنیاد پر وقت کے تیر(Theory of Time Arraow) کی تھیوری پیش کی تھی۔Thermodynamics نظریاتی طبیعات کی وہ شاخ ہے جو حرکت اور توانائی کی مختلف میں تبدیلی سے متعلق ہے۔اس کے دو قوانین ہیں:

1۔ بقائے توانائی Law of Conservation of Energy

2۔ ناکارگی Entropy

پہلے قانون کے مطابق توانائی کو مختلف شکلوں میں بدلا جا سکتا ہے مگر اسے تخلیق یا فنا نہیں کیا جا سکتا اور دوسرے قانون کی رو سے ناکارگی مادے کی دی گئی کسی حالت میں ممکنہ تبدیلی کا عمل ہے۔آسان لفظوں میں یہ وقت کے ساتھ چیزوں میں بدنظمی پھیلنے کا رجحان ہے۔اسی کو وقت کا تیر کہتے ہیں۔سٹیفن ہاکنگ(08۔جنوری 1942ء–14۔ مارچ2018ء) نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی کتاب A Brief History of Time میں لکھا ہے کہ: وقت کے کم از کم تین تیر ہیں۔ پہلا تو وقت کا تھرموڈائنامک تیر ہے۔ یہ وہ وقت کی وہ سمت ہے جس میں بے ترتیبی بڑھتی ہے۔پھر وقت کا نفسیاتی تیر ہے۔ یہ وہ سمت ہے جس میں ہمیں وقت گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ہم ماضی کو یاد رکھتے ہیں۔آخر میں وقت کا کائناتی تیر ہے۔ یہ وقت کی وہ سمت ہے جس میں کائنات سکڑنے کی بجائے پھیل رہی ہے۔ نیز یہ وقت کی سمت کا ہمارا موضوعی احساس یعنی وقت کا نفسیاتی تیر ہمارے شعور میں وقت کا تھرموڈائنامک تیر سے متعین ہوتا ہے اور کمپیوٹر کی طرح ہم چیزوں کو اس ترتیب میں یاد رکھتے ہیں جس میں انٹروپی بڑھتی ہے(7)

سٹیفن ہاکنگ کے اس بیان کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وقت کی ناقابلِ واپسی (Irreversibility) خصوصیت کو تیر کی علامت کے ذریعے واضح کیا گیا ہے اور درحقیقت انسانی شعور کے لیے وقت کے بہاؤ کو اپنی مرضی کا رخ عطا نہ کر سکنے میں جو جبریت کا پہلو ہے وہی اس نظریے کا مرکزی خیال ہے۔ناول " جاگے ہیں خواب میں " میں انسانی حافظے کی یک سمتی کا سوال اسی تناظر میں اٹھایا گیا ہے۔

اختر رضا سلیمی نے زمان کی فکری رہنمائی کے لیے ایک عالمانہ کردار عرفان تخلیق کیا ہے۔ان دونوں کرداروں کے نام بھی ان کی شخصیت کو سمجھنے میں گہری معنویت کے حامل ہیں۔عرفان کا زمان کو یہ بتانا کہ ہر حقیقت پہلے خیال ہوتی ہے،اس کے ذہن میں حیات و کائنات کے حوالے سے متعدد سوالوں کو جنم دیتا ہے اور وہ یہ سوچنے پہ مجبور ہو جاتا ہے کہ آیا انسان قوانینِ فطرت کا غلام ہے یا اسے ان پر تفوق حاصل ہے۔ناول میں زمان کے لاشعور کی سیاحت کے زریعے اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ قوانینِ فطرت کی گرفت صرف انسانی وجود کی حد تک ہے،اس کا شعور ان قوانین سے آزاد ہے اور وقت جس کی حیثیت عام حالات میں ایک جبر کی ہے،شعور کی سطح پر وہ ایک قدر میں بدل جاتا ہے۔ ناول میں بیانیے کی تبدیلی بھی چند ایک مقامات پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے جن میں ایک اہم واقعہ سیّد احمد شہید بریلوی کے سکھوں کے خلاف جہاد کا منظر ہے جہاں ایک فرد کا حافظہ اجتماعی حافظے کی طرف اور انفرادی طور پر دکھایا دیکھا گیا ایک خواب اسلامی ریاست کے قیام کے اجتماعی خواب کی واقعاتی جہت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ناول میں زمان کے اجتماعی لاشعور کا بیدار ہونا اور اکیسویں صدی میں ہوتے ہوئے ڈھائی ہزار سال کے حافظے میں سانس لینا قاری کے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا کرتا ہے کہ کیا متوازی کائنات کا نظریہ واقعی درست ہے؟ میرے نزدیک اس ناول کا نقطہ "انحراف" وہ لمحہ ہے جب شعوری سطح پر ماضی سے حال میں واپس آنے کے بعد زمان کے ذہن میں ایک اور کھڑکی کھل جاتی ہے اور اس کھڑکی کا رخ مستقبل کی طرف ہے۔

> "اسے لگا جیسے وہ ایک بلیک ہول ہے جو ہر اس شے کو جس میں اس کے لیے کوئی بھی کشش ہے خواہ وہ نفرت کی ہی کیوں نہ ہو،نگل رہا ہے اور اس وقت تک نگلتا رہے گا جب تک اس کے اندر اس کے لیے کوئی بھی کشش موجود ہے۔(8)"

اس مقام پر پہنچ کر زمان جس کا ذہنی پس منظر طبیعات کا ہے،خود کو فرائڈ اور یونگ کے نظریاتِ خواب میں الجھا ہوا پاتا ہے اور پھر مسلسل تجزیے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہر وجود کا اپنا ازل اور ابد ہے۔یہ وہ سچائی ہے جس کا ادراک ہم اس لیے نہیں کر پاتے۔کیوں کہ ہم نے وقت کی ماہیت کو سائنس،فلسفہ مابعد الطبیعات اور مذہب کی روشنی میں سلجھنے کی کوشش کی ہے۔جب کہ درحقیقت کائنات کی ہر شے کے لیے وقت کی ماہیت بھی مختلف ہے اور تمام اشیا کے لیے Line Time کے ساتھ ساتھ Zone Time بھی مختلف ہیں۔ناول میں زمان کا اپنی موت کو ایک ذہنی کیفیت سمجھنا وقت اور انسانی روح کی ماورائیت کے ساتھ ساتھ خواب کی انسانی شعور کے حوالے سے گہری معنویت میں ایک اور جہت کا اضافہ کرتا ہے کیوں کہ وہ اپنی موت کا خواب بھی پہلے دیکھ چکا ہے۔اس ضمن میں یہ کہنا شاید غلط نہیں ہوگا کہ جہاں طبیعات کی حد ختم ہوتی ہے وہاں سے مابعد الطبیعات کا آغاز ہوتا ہے اور زمان کے خواب کے سفر سے شروع ہونے والا یہ ناول قاری کے ذہن میں فکر کے بہت سے در وا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ علم کی انتہا حیرت ہے۔

> " وہ تہذیب جو تغیر سے نا آشنا ہو تاریخ سے بھی نا آشنا رہتی ہے۔مگر تاریخ صرف واقعات

کا ڈھیر نہیں بل کہ ان کے پیچھے ایک ایسے تناظر کا ہونا بھی لازمی ہے جس کی نسبت سے ان کی پہچان ہو سکے۔وقت کی گزران کا احساس تاریخی شعور کی اہم ترین شرط ہے"۔(9)

ڈاکٹر وزیر آغا کے اس بیان کی روشنی میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث کے ضمن میں منتخب پاکستانی ناولوں کے اس جائزے میں یہ نکتہ ضرور واضح ہوا کہ اردو ناول اپنے عصر اور تاریخ و تہذیب سے ہمیشہ جڑا ہوا رہا ہے اور اس میں سماجی حرکیات کا شعور روحِ عصر کی شکل میں موجود نظر آتا ہے۔ناول نگار تاریخیت کے شعور کے بغیر ناول نہیں لکھ سکتا کیوں کہ اس کا کام ہی تاریخی شعور کی ترسیل کرنا ہے لہٰذا تاریخیت اور نو تاریخیت کا سروکار ادب کی اس روایت سے ہے جو تاریخی حقائق کو معروضی نقطہ نگاہ سے پرکھتی ہے اور اسے ایک جمالیاتی تجربے میں بدل دیتی ہے۔

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان،محمد سلیم الرحمٰن ،مرتبین،منتخب ادبی اصطلاحات شعبہ اردو(لاہور: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء)،ص۱۰۸۔

۲۔ ڈاکٹر اعجاز راہی،اظہار(راولپنڈی:،دستاویز پبلشرز،۱۹۸۴ء)،ص۱۸

۳۔ فہیم اعظمی،جنم کنڈلی(کراچی: الباقریہ،۱۹۸۴ء)،ص۶۸

۴۔ اختر رضا سلیمی،جاگے ہیں خواب میں(لاہور: دستاویز پبلشرز،۲۰۱۵ء)،ص۹۷۔

۵۔ ایضاً،ص۱۰۸۔

۶۔ ایضاً،ص۱۷۰۔

۷۔ سٹیفن ہاکنگ،وقت کا سفر،مترجمہ ناظر محمود(لاہور:،روہتاس بکس،۱۹۹۳ء)،ص۲۰-۲۱

۸۔ اختر رضا سلیمی،جاگے ہیں خواب میں،ص۲۱۹۔

۹۔ ڈاکٹر وزیر آغا،تخلیقی عمل (لاہور:مجلس ترقی ادب،۲۰۱۱ء)،ص۵۶

مآخذ:

۱۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان،محمد سلیم الرحمٰن ،مرتبین۔منتخب ادبی اصطلاحات۔لاہور: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،۲۰۰۵ء

۲۔ ڈاکٹر اعجاز راہی،اظہار۔راولپنڈی:،دستاویز پبلشرز،۱۹۸۴ء۔

۳۔ فہیم اعظمی،جنم کنڈلی۔کراچی: الباقریہ،۱۹۸۴ء۔

۴۔ اختر رضا سلیمی،جاگے ہیں خواب میں۔لاہور: دستاویز پبلشرز،۲۰۱۵ء۔

۵۔ سٹیفن ہاکنگ۔وقت کا سفر،مترجمہ ناظر محمود۔لاہور:،روہتاس بکس،۱۹۹۳ء۔

۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا،تخلیقی عمل۔لاہور:مجلس ترقی ادب،۲۰۱۱ء۔